ایم خالد فیاض *

شہری کلچر میں بڑھاپے کی تصویریں: بودلیئر کی شاعری کے تناظر میں

گوتم بدھ نے ضعیفی کو زندگی کی چار بڑی اذیتوں میں شمار کیا تھا۔ ضعیفی، جو کہ فرد کی جسمانی اور ذہنی توانائیوں کے مکمل خاتمے اور اعضا کی سراسر بے چارگی و ناکارگی کا نام ہے، زیست کا آخری اور انتہائی تکلیف دہ دَور ہے۔ یہ بڑھاپے کی آخری حد ہے جہاں فرد کا زندگی سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور موت ہی اب اُس کی آخری پناہ گاہ رہ جاتی ہے۔

عمر رسیدگی یا بڑھاپا، ضعیفی سے پہلے کا دَور ہے۔ جہاں جسمانی اور ذہنی توانائیوں کے انہدام کا آغاز ہوتا ہے۔ وِل ڈیورانٹ (Will Durant) کے الفاظ میں:

> بنیادی طور پر یہ جسم کی ایک کیفیت ہے۔ جسم کی موج حیات اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔
> بڑھاپا جسمانی یا ذہنی انحطاط کا دور ہے۔[1]

اصل میں یہ دَور فرد میں جسمانی سطح پر کم اور نفسیاتی سطح پر کہیں زیادہ اتھل پتھل کا دَور ہے۔ وہ نہ صرف اپنی کم ہوتی توانائیوں کو محسوس کر رہا ہوتا ہے بلکہ نئی نسل کی قوت و کارکردگی سے اپنی شکستہ کارکردگیوں کا موازنہ کر کے احساسِ کمتری میں مبتلا بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ مستقبل قریب میں موت سے ہمکنار ہونے کا خوف، ماضی کی خوشگوار یادیں اور جوانی کی طرف لوٹ جانے کی خواہش، یہ اور ایسے

احساسات اُسے کئی طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں الجھا دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ روحانی کرب میں مبتلا رہتا ہے اور اذیت جھیلتا ہے۔

جدید عہد میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے انتہا ترقی کی بدولت جنم لینے والے جدید ترین شہروں اور متمدن سماجوں نے بڑھاپے کی طبعی اور نفسیاتی الجھنوں اور اذیتوں کو دوچند کر دیا۔ صنعتی و حرفتی اور تیز رفتار شہری زندگی نے بڑھاپے کی اس سماجی حیثیت کو بھی شدت سے متاثر کیا جو کسی حد تک اُس کے روحانی اور نفسیاتی آزار کے مداوے کا باعث تھی۔ ان جدید اور ترقی یافتہ شہروں کی نسبت گاؤں، دیہاتوں اور قدیم معاشروں میں بڑھاپے کو ایک وقار حاصل تھا۔ بڑھاپا تجربے، مشاہدے اور علم کی علامت تھا، نوجوانوں کی رہنمائی کا ضامن تھا۔ لوگ اُن کے وسیع تجربے کی وجہ سے زندگی کے معاملات میں اُن سے صلاح و مشورہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اہم امور میں اُن کے فیصلوں کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ یہ خیال تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ نہ صرف تجربے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مزاج میں ٹھہراؤ بھی آ جاتا ہے اور اس عمر میں جذبات کے بجائے عقل حاوی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی داستانوں میں جب ہیرو جذبات کی تندی و تیزی کے ہاتھوں مغلوب ہو جاتا ہے یا اندیشوں، وسوسوں، خدشات و خطرات میں اس حد تک گھر جاتا ہے کہ اُسے ان سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تو عمر رسیدہ بزرگ قدم قدم پر اُس کی رہنمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایسی راہیں سجھاتے ہیں جن کی مدد سے ہیرو مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔

لہٰذا بوڑھے افراد کی طرف لوگوں کے اس رویے کی وجہ سے، بوڑھوں کو اپنی سماجی اہمیت کا احساس رہتا تھا۔ پھر یہ کہ ایسے سماج میں بوڑھے افراد نئی نسل کے لیے معاشی طور پر بوجھ نہیں تھے بلکہ اُن کی نگہداشت نوجوانوں کا اخلاقی فریضہ تھا۔

لیکن جب معاشروں میں تیز رفتاری بڑھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت بڑے بڑے اور جدید ترین شہروں کا قیام عمل میں آیا اور زندگی کی قدریں اور حقیقتیں تیزی سے بدلنے لگیں تو بوڑھے افراد کا معاشرتی مقام یک لخت گر گیا کیونکہ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی اس جدید تر زندگی کا ساتھ دے سکیں۔ علوم کی بے پناہ ترقی، معلومات اور خبروں کے سیلاب اور نت نئے تجربوں

کے سامنے بوڑھے افراد کا علم اور تجربہ ازکار رفتہ قرار پایا۔ اب دنیا کے بدلتے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے بوڑھوں کا نوجوانوں کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہوگیا کیونکہ نئی تبدیلیوں اور نئی تعلیم کی وجہ سے نوجوان نسل بوڑھی نسل سے کہیں آگے بڑھ گئی۔ اسی لیے ان جدید ترین معاشروں کا رویہ بھی بوڑھے افراد کے لیے بدل گیا۔ بوڑھوں کا علم اور تجربہ اُن کے لیے فرسودہ اور اُن کا وجود اُن کے لیے معاشی بوجھ بن گیا۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس نے اگرچہ طب کے میدان میں بے پناہ ترقی کر کے انسان کی اوسط عمر میں قابلِ قدر اضافہ کر دیا اور لوگ زیادہ سے زیادہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم بھی رکھنے لگے لیکن اسی سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت وجود میں آنے والے جدید صنعتی شہروں میں ان بوڑھوں کی بامعنی گنجائش نہ رہی۔ شہری تمدن کی طبی ترقی نے فرد کو طویل عمر دی اور تیز رفتار صنعتی ترقی نے ان طویل العمر افراد کو بے سہارا اور بے آسرا کر دیا۔ بڑھاپا شہر میں کس مپرسی، غربت، ناچاری، بیماری، نااُمیدی، غمگینی اور ناقدری کی علامت بن گیا۔

یوں شہروں میں بوڑھوں کی طبعی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی نفسیاتی پیچیدگیوں پر مبنی کربناک تصویریں زیادہ دکھائی دینے لگیں۔ شہروں نے بوڑھوں کو طبعی زندگی دے کر معاشرتی زندگی سے جس طرح بے دخل کیا وہ اُن کے لیے اور بھی سوہانِ روح کا باعث بنا۔ جس تنہائی، بے چارگی اور ناقدری کا وہ اب شکار ہوئے، پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔

چارلس بودلیئر (Charles Baudelaire) (۱۸۲۱ء–۱۸۶۷ء) کی نثری نظموں پر مبنی مشہور کتاب پیرس کا کرب میں ہمیں بڑھاپے کی کچھ ایسی ہی دردناک اور اداس تصویریں ملتی ہیں۔ میراجی نے بودلیئر کے بارے میں ایک بات کہی تھی۔ اگرچہ انھوں نے یہ بات اس کی کتاب بدی کے پھول کا جائزہ لیتے ہوئے کہی تھی مگر اس کا اطلاق بودلیئر کے پورے شاعرانہ رویے پر ہوتا نظر آتا ہے اور یہاں ان نظموں کو سمجھنے کے لیے بھی میراجی کے ان تنقیدی جملوں کو ایک نظر دیکھ لینا یقیناً مفیدِ مطلب ہوگا۔ لکھتے ہیں:

> وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا ذہن پریشان ہو؛ جس کی طبیعت غور وفکر کی عادی ہو؛ جس کے تخیل پر ہر وقت ملال انگیز تصورات مرگھٹ کے دھویں کی طرح چھائے رہتے ہوں، اور ان وحشت ناک تصورات کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹنے میں آتا ہو؛ جسے سیدھی

> سادی فطری باتوں سے نفرت ہو اور غیر معمولی خیالات اور انوکھے احساسات کے زیر اثر زندگی گذارنا جس کے لیے ایک لازمۂ حیات ٹھہر چکا ہو۔[۲]

پیرس کا کرب کی نظموں کے پیچھے بھی ہمیں ایسا ہی ملال انگیز، پریشان، انوکھے احساسات کا مالک، غور وفکر کرتا ہوا بودلیئر دکھائی دیتا ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ نظمیں جدید شہر میں پیدا ہونے والی تلخیوں اور المناکیوں کا دردناک بیان ہیں اور پیرس جیسے جدید ترین شہر پر سماجی تنقید کا بہترین تخلیقی اظہار یہ ہیں۔ بودلیئر نے اپنی ان شاہکار نظموں میں شہر اور شہر میں بسنے والوں کے لامتناہی دُکھ اور درد کو موضوع بنایا ہے۔ صنعتی اور شہری زندگی کی ان کربناکیوں اور تنہائی کی ہولناکیوں کو بیان کرنے کے لیے اُس نے بوڑھے کرداروں کا بھی سہارا لیا ہے۔ بوڑھے افراد کو اُس نے اس صنعتی معاشرے کے بعض ایسے پہلوؤں کی تفہیم کا ذریعہ بھی بنایا ہے جو صرف معمر افراد کے ذریعے ہی دیکھے اور سمجھے جا سکتے ہیں۔ یوں شہری تناظر میں اُبھرنے والے بڑھاپے کو بودلیئر نے اپنے احساس اور شعور میں رچا کر تخلیقی سطح پر پیش کیا ہے اور ایسی پُر درد تصویریں بنائی ہیں جو شہری زندگی میں بوڑھے افراد کے مقام کے بارے میں ایک سوالیہ نشان بن کر اُبھرتی ہیں۔

فرد ساری زندگی اپنے بچوں پر محبتیں نچھاور کرتا ہے اور ان محبتوں کو نچھاور کرتے کرتے جب ایک دن وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اُس وقت خود اُس کے اپنے وجود کے اندر چاہت اور محبت کی شدید طلب پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے ان بچوں سے جن پر وہ ساری زندگی محبت لٹاتا رہا، محبتوں کا طالب ہوتا ہے اور یہ محبتیں بچپن اور جوانی کی محبتوں سے اپنی کیفیت میں قدرے مختلف بھی ہوتی ہیں، لیکن صنعتی سماج میں جکڑا اور تیز رفتار زندگی کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے تقاضوں پر پورا اُترنے والا جدید شہر کا نوجوان، بوڑھوں کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی اہلیت کھو چکا ہوتا ہے بلکہ وہ اکثر اوقات بوڑھوں کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہ صورتِ حال بوڑھوں کے لیے انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے۔ وہ ایسی صورت میں نئے سرے سے محبتوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ وہ بچوں کے بچوں سے محبت کرنا شروع کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے انجام پر کھڑے ہوکر زندگی کی نئی ابتدا پر اپنی آخری محبتیں بھی نچھاور کرنا چاہتے ہیں لیکن یہاں بھی انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ مفاد

پرست جدید سماج کا گھناؤنا پن اُن کے چہروں کو مسخ کر کے اس قدر خوف ناک بنا چکا ہوتا ہے کہ معصوم بچے بھی اُن سے ڈر جاتے ہیں۔ وہ عمر کے اس دَور میں دنیا سے جس قدر زیادہ لگاؤ محسوس کرتے ہیں دنیا اُن سے اتنا بیزار ہونے لگتی ہے۔ وہ جس قدر زیادہ محبت چاہتے ہیں انھیں اس قدر اجنبیت اور نفرت ملتی ہے۔ اس کا موثر اظہار بودلیئر نے اپنی نظم ''بوڑھی عورت کی مایوسی'' میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> جھریوں سے ماری ہوئی بڑھیا خوشی کے مارے پھول گئی، جب اُس نے خوب صورت بچے کو دیکھا جس سے ہر کوئی ہنسی مذاق کررہا تھا۔ یہ حسین و نازک نقش، بڑھیا ہی کی طرح، بغیر دانت اور بغیر بالوں کے۔ وہ آگے بڑھی اور تبسم کے ساتھ بچے سے کھیلنے لگی۔ بچہ سہم گیا اور اس بے چاری عورت کے پیار کے جواب میں تیزی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اُس نے چیخ و پکار سے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا۔ بیچاری بوڑھی عورت ایک ابدی تنہائی میں پیچھے ہٹ گئی اور ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ اپنے آپ کو یہ کہہ رہی تھی ''آہ ہم بدقسمت بوڑھی عورتیں! ہمارے لیے وہ عمر گذر گئی کہ ہم کسی کے دل کو لبھا سکیں۔ یہ معصوم بچے بھی، جن کو ہم خوش کرنا چاہتے ہیں، ہمیں دیکھتے ہی سہم جاتے ہیں۔''[۳]

اس نظم میں مغرب کے شہری سماج میں سہ نسلی خاندان کے ٹوٹنے کا المیہ بھی موجود ہے، جس میں دادا دادی، ماں باپ اور پوتا پوتی ایک ساتھ رہتے ہیں۔ بودلیئر اس سماج میں تیسری نسل کی پہلی نسل سے اجنبیت کو نمایاں کرتا ہے۔

اس سے آگے چلیں تو ہمیں ایک ''بوڑھا مداری'' ملتا ہے جو بڑھاپے، افلاس اور کرب و ماندگی کی ایسی ملی جلی تصویر ہے جس سے جدید تمدن کا کھوکھلا پن اور تضاد اپنی تمام تر شدت کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں ایک طرف نوجوان ہیں، خوشیاں ہیں، دولت ہے اور دوسری طرف بڑھاپا ہے، آزار ہے اور افلاس ہے۔ اپنی اس نظم ''بوڑھا مداری'' میں بودلیئر نے پہلے ایک میلے کا منظر پیش کیا ہے، جس سے جدید شہری زندگی کے طور اطوار پر روشنی پڑتی ہے:

> درحقیقت یہاں ایک زبردست مقابلہ ہوتا ہے، یہاں نعرہ بازی ہوتی ہے، بگل بجتے ہیں، تانبے کے کھڑکھڑانے کا ملاجُلا شور ہوتا ہے اور پٹاخوں کے دھماکے ہوتے ہیں۔ ہوا، بارش اور سورج کی وجہ سے سخت اور گندمی چہرے لال دموں اور نقالیوں کے

ساتھ ہزار روپ بدلتے ہیں۔ وہ بڑی مشاقی سے ایسی فقرہ بازی کرتے ہیں جن کے اثر کے بارے میں وہ بڑے متیقن ہوتے ہیں ...... رقاصائیں پریوں یا شہزادیوں کی طرح خوبصورت ناچ ناچتی ہیں ...... یہ سب کچھ روشنی، گرد، چیخوں، خوشیوں، ہنگاموں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کچھ خرچ رہے تھے، کچھ کما رہے تھے اور دونوں یکساں خوش تھے۔[۴]

اور پھر اس کے بعد بودلیئر اُس غریب بوڑھے مداری کا نقشہ کھینچتا ہے اور ساتھ ہی معاشرتی معاشی تضاد کو بھی اُبھارتا ہے۔

خوانچوں کی قطار کے سب سے آخر میں، میں نے ایک شرمیلے، غریب مداری کو دیکھا جو اپنے آپ کو اس شان و شوکت سے جلا وطن کیے ہوئے، خمیدہ کمر، ضعیف، درماندہ، ایک انسانی کھنڈر کی طرح اپنی دکان کے کھمبے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یہ دکان ایک پریشان حال وحشی کی جھونپڑی سے بھی زیادہ بوسیدہ تھی اور اُس کی موم بتی کے پگھلتے ہوئے اور دھواں دیتے ہوئے کنارے اُس کی مفلسی کو اور نکھار رہے تھے۔
ہر جگہ خوشی، نفع کے کاروبار اور عیاشی، ہر جگہ کل کی روٹی پر یقین، ہر جگہ طاقت کا وحشیانہ شور، لیکن یہاں سراسر غربت، پامال غربت اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ مضحکہ خیز چیتھڑے...... اس غریب کا چہرہ مسکراہٹ سے محروم تھا۔ وہ رو نہیں رہا تھا، وہ ناچ نہیں رہا تھا، وہ ہاتھ نہیں چلا رہا تھا، وہ چلاّ نہیں رہا تھا، وہ کوئی خوش کن یا پُر درد گانا نہیں گا رہا تھا، وہ کچھ مانگ نہیں رہا تھا، وہ خاموش تھا، اُس پر جمود طاری تھا، وہ سب کچھ چھوڑ بیٹھا تھا، سب کچھ ترک کر بیٹھا تھا، اس کی تقدیر بن چکی تھی۔[۵]

اور آخر میں بودلیئر اس نظم کا انجام یوں کرتا ہے:

میں اُس بوڑھے ادیب کا نقشہ دیکھ کر آیا ہوں جو کہ اپنی اُس نسل کے کام آ چکا ہو جس کا وہ ایک ممتاز اور دل خوش کن مداری تھا۔ بوڑھا شاعر، بغیر دوستوں کے، بغیر گھر بار کے، بغیر اولاد کے، غربت اور عوام کے ناشکرے پن کی وجہ سے ذلیل و خوار، اور جس کی دکان میں احسان فراموش دنیا اب داخل ہونے کے لیے بھی تیار نہیں۔[۶]

یوں بودلیئر ہمیں دکھاتا ہے کہ مفاد پرست، خودغرض اور احسان فراموش دنیا کیسے بوڑھوں کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس جدید دنیا میں فرد اپنی ہی نسل کے کام آ سکتا ہے اور جو

اپنی نسل کے کام آچکا ہو وہ اس دنیا کی نئی نسل کے لیے کوئی معنی، کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

نظم ''بیوائیں'' میں ہمیں ایک بوڑھی اور غریب بیوہ خاتون نظر آتی ہے۔ بودلیئر نے اُس کی تنہائی اور غربت کو موضوع بنایا ہے اور یہاں بھی ہمیں وہ یہی دکھاتا ہے کہ جدید شہر کے پاس اُس بیوہ کی تنہائی کا کوئی مداوا نہیں اور وہ زندگی کی پُر رونق شاہراہ سے الگ تھلگ زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ اُسے اپنے بڑھاپے اور غربت کی وجہ سے اُس شہر کی خوشیوں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں۔ بودلیئر لکھتا ہے:

> وہ (بیوہ) ایک کھردری سی، سیدھی سادھی، مگر پھٹی ہوئی شال اوڑھے اپنے جسم سے ایک متکبرانہ رواقیت کا اظہار کرتی جا رہی تھی ...... مجھے معلوم نہیں اُس نے کس گھٹیا سی طعام گاہ میں کس طریقے سے کچھ کھایا پیا۔ میں ...... اُس کی حرکتوں کا غور سے مشاہدہ کرتا رہا، جب کہ وہ اپنی عقابی آنکھوں سے، جو کہ آنسوؤں سے جھلسی ہوئی تھیں، اخبار میں کچھ ذاتی دلچسپی کی خبریں ڈھونڈ رہی تھی۔
>
> بالآخر دوپہر کو، خزاں کے ایک دلکش آسمان کے نیچے — اُس آسمان کے نیچے جہاں سے حسرتوں اور یادوں کا ہجوم نازل ہوتا ہے — وہ ایک باغ کے کونے میں ہٹ کر بیٹھ گئی تا کہ بھیڑ سے دُور وہ ایک محفلِ نغمہ و سرود کو سن سکے ...... اس مہیب دن میں یہی اُس بے چاری بڑھیا کے لیے اوباشی کا سامان تھا، اس دن میں جو اُس نے بغیر کسی دوست، بغیر کسی بات، بغیر کسی مسرت، بغیر کسی ہم راز کے گذارا۔ یہی تسکین قلب کا ذریعہ تھا، یہ دن جس کا سال میں کئی مرتبہ اُسے استقبال کرنا پڑتا ہے — غالبًا ۳۶۵ مرتبہ![۷]

ایک بوڑھی عورت کی منظرکشی بودلیئر بند کھڑکی کے اندر جھانک کر کرتا ہے، جو دنیا سے الگ تھلگ بڑھاپے کے دکھ درد سہ رہی ہے۔ وہ اپنی نظم ''کھڑکیاں'' میں لکھتا ہے:

> اس تاریک یا روشن سوراخ کے پیچھے زندگی سانس لیتی ہے، خواب دیکھتی ہے، دکھ سہتی ہے، چھتوں کی لہروں کے اوپر میں ایک پختہ کار عورت کو دیکھ رہا ہوں جو کبھی بھی باہر نہیں نکلتی۔ جھریوں سے ماری ہوئی غریب بڑھیا کسی چیز کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ اُس کے چہرے، کپڑوں، اداؤں، بلکہ اُن کے بغیر میں نے اُس عورت کی زندگی کی کہانی

ترتیب دے لی ہے۔[۸]

بودلیئر اپنی ان نظموں میں جہاں بھی بڑھاپے کی تصویر کھینچتا ہے، درماندگی اور افلاس اُس کے بنیادی رنگ قرار پاتے ہیں۔ بوڑھے افراد چونکہ جدید صنعتی نظام کے مفید کل پرزے نہیں بن سکتے لہٰذا اس صنعتی نظام میں معاشی تنگ دستی اُن کا مقدر بن جاتی ہے۔

لیکن اس نظام کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ جو لوگ یا افراد اس نظام کی پیدا کردہ مادی اور معاشی دوڑ کے تقاضوں کو نبھانے کے اہل نہیں ہوتے، یہ نظام انھیں غربت اور بڑھاپے کی دہلیز پر وقت سے پہلے پھینک جاتا ہے یعنی جو لوگ اس نظام کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں ہوتے وہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بودلیئر کی کچھ نظموں میں ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو اگرچہ طبعی طور پر تو بڑھاپے کے عہد میں داخل نہیں ہوئے لیکن اس ظالم اور خودغرض صنعتی معاشرے نے انھیں غربت کے ایسے جال میں پھانسا ہے کہ وہ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ ایک طرف اپنی غربت کی تاب نہیں لا سکتے اور دوسری طرف لوگوں کی امارت ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔

جدید سماج کے اس تضاد کا شکار ہونے کی وجہ سے اُن کے وجود کی ساری توانائیاں زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور اُن کی جوانیاں اس سماج کے ظالمانہ نظام کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ایسے کرداروں کی ایک موثر مثال ہمیں بودلیئر کی نظم ''غریبوں کی آنکھیں'' میں ملتی ہے۔ جہاں نظم کا ہیرو ایک ریستوران میں اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھا ہے اور سامنے سڑک پر اُسے چالیس سالہ وہ شخص نظر آتا ہے جو ناسازگاریِ حالات کے سبب بڑھاپے کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے۔ بودلیئر لکھتا ہے:

> ہمارے سامنے سڑک پر ایک چالیس سالہ شریف آدمی کھڑا تھا۔ پژ مردہ چہرہ، سفیدی مائل داڑھی، ایک بچہ ایک اُنگلی سے لگائے اور دوسرے بازو پر ایک اور بچہ اُٹھائے...... وہ ایک بوڑھی خادمہ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا...... یہ صورتیں سب کی سب چیتھڑوں میں ملبوس، ازحد سنجیدہ تھیں۔[۹]

ایسا ہی ایک کردار نظم ''کھوٹا سکہ'' میں بھی سامنے آتا ہے۔ اُس کے بارے میں اگرچہ شاعر نے یہ وضاحت بالکل نہیں کی کہ وہ عمر کے کس حصے میں ہے مگر اُس کی ظاہریت میں بڑھاپے کے

عناصر موجود ہیں جو اسی جدید سماج کے عطا کردہ ہیں۔

> ہمیں ایک مفلس ملا جس نے کانپتے ہوئے اپنی ٹوپی بڑھائی۔ میں نے اُس کی التجا سے بھری ہوئی آنکھوں کی خاموش فصاحت سے زیادہ کوئی پریشان کُن چیز نہیں دیکھی، جن میں بیک وقت ایک حساس شخص کے لیے جو انھیں پڑھ سکے، بڑی ہی عاجزی اور بڑی ہی ملامت پنہاں تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بڑا ہی گہرا اور پیچیدہ احساس تھا، جیسے ایک کُتے کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں، جسے کوئی پیٹ رہا ہو۔[۱۰]

جب ہم پیرس کا کرب کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو دو باتوں کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بودلیئر جدید شہری زندگی کو سخت ترین تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اُس کے لیے ان جدید شہروں کی وہ زندگی جو امیری اور غریبی کے درمیان تفاوت کو بڑھانے کا باعث ہے، قطعاً قابلِ قبول نہیں اور غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ بودلیئر صاف صاف کہہ رہا ہے کہ صنعتی شہروں کی مادی دوڑ ہی افراد کو بوڑھا کر دینے کی موجب ہے۔ جو لوگ اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں وہ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ جدید شہروں میں مادی ترقی کا حصول، معاشی کشاکش، خاندانی رشتوں میں ٹوٹ پھوٹ اور فرد کا فرد سے اجنبیت اور غرض کا رشتہ اور اس کے نتیجے میں تنہائی، یہ وہ عوامل ہیں جو افراد کی جوانیوں کو وقت سے پہلے پژ مردہ کر دیتے ہیں اور یوں، یہ شہر جس بڑھاپے کو جنم دیتے ہیں اُسے اپنے سے اور پرے دھکیل کر مزید سے مزید تر تنہائیوں اور افلاس کا شکار کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے بڑھاپا انتہائی کس مپرسی اور بے چارگی کے عالم میں بسر ہوتا ہے۔

حوالہ جات

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ زمیندار پوسٹ گریجویٹ کالج، گجرات۔

۱۔ وِل ڈیورانٹ (Will Durant)، نشاطِ فلسفہ، مترجم محمد اجمل (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص۴۸۴۔

۲۔ میراجی، مشرق و مغرب کے نغمے (کراچی: آج، ۱۹۹۹ء)، ص۱۳۴۔

۳۔ چارلس بودلیئر (Charles Baudelaire)، پیرس کا کرب، مترجم ڈاکٹر لئیق بابری (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۸۲ء)، ص۴۰۔

۴۔ ایضاً، ص ۷۱–۷۲۔

۵۔ ایضاً، ص۷۲–۷۳۔

۶۔ ایضاً، ص۴۷۔

۷۔ ایضاً، ص۶۲– ۶۳۔

۸۔ ایضاً، ص۱۳۶۔

۹۔ ایضاً، ص۱۰۳–۱۰۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۲۔

مآخذ

بودلیئر، چارلس (Charles Baudelaire)۔ پیرس کا کرب۔مترجم ڈاکٹر لئیق بابری ۔لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۸۲ء۔

ڈیورانٹ، وِل (Will Durant)۔ نشاطِ فلسفہ۔مترجم محمد اجمل ۔لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔

میراجی۔ مشرق و مغرب کے نغمے ۔کراچی: آج، ۱۹۹۹ء۔